پروفیسر ثناء اللہ مجاہد

خاص

تعریف خاص کی تعریف اصول کی کتابوں میں اس طرح کی گئی ہے اما الخاص فکل لفظ وضع لمعنی معلوم علی الانفراد۔

(خاص ہر وہ لفظ ہے جو بطور انفراد کے کسی ایک ہی معنی معلوم کے لئے وضع کیا گیا ہو)۔

لغوی اعتبار سے یہ لفظ "خصّ۔یخصّ۔خصوصًا" کا اسم فاعل ہے جس کے معنی کسی شے کا کسی دوسری شے کے ساتھ اس طرح مخصوص ہو جانا کہ اس سے تجاوز نہ کرے۔

خاص کی مندرجہ بالا تعریف میں کلمہ "کل" جنس کے درجہ میں ہے جس میں عام الفاظ شامل ہیں اور باقی پابندیاں فصل کے طور پر ہیں چنانچہ لفظ "وضع لمعنی" مہملات کو خارج کرتا ہے اور اگر لفظ خاص کے معنی معلوم المراد ہوں تو اس پابندی سے مشترک الفاظ نکل جائیں گے کیونکہ سب مشترک الفاظ معلوم المراد نہیں ہوتے اور اس کے معنی معلوم البیان ہوں تو مشترک الفاظ نہیں نکلیں گے لیکن وہ "علی الانفراد" کی قید سے نکل جائیں گے۔ اصول فقہ کی اصطلاح میں خاص کا کلمہ انفرادیت اور نفی شرکت کے لئے بولا جاتا ہے اس لئے لفظ خاص ہمیشہ ایک ہی معنی پر دلالت کرتا ہے اور ایک حیثیت سے زیادہ افراد کو شامل نہیں ہو سکتا۔ اصول فقہ کے تمام آئمہ خاص کے متعلق دو باتوں پر متفق ہیں۔ ایک اس پر کہ خاص معین معنی کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔ دوسرے اس بات پر کہ خاص کے معنی میں انفرادیت ہر حال ملحوظ ہے۔

خاص کی اقسام

خاص میں انفرادیت کو عام کر دینے سے خاص کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں۔ اور خاص "خاص الجنس" ہوگا یا "خاص النوع" "خاص الفرد" یا "خاص العدد" ہوگا۔

خاص جنسی

اصولیوں کے ہاں جنس کی تعریف یہ ہے۔
"جنس وہ کلّی ہے جو ایسے کثیر.ن پر محمول ہوتا ہے جو اغراض و مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں، حقائق کے لحاظ سے نہیں"۔

یعنی خاص جنسی وہ لفظ ہے جو ایک ایسے کلّی معنی کے لئے وضع کیا جائے جس میں اعتباری انفرادیت ہو اور وہ کلی مفہوم صادق آسکتا ہو ایسے ر د پر جن کے شرعی احکام مختلف ہوں۔ مثلاً انسان یہ ... ایک کلی معنی کے لئے مقرر گئے ہیں اور اس کلی مفہوم میں ذہنی وحدت اور انفرادیت اعتبار کی گئی ہو۔ یعنی افراد سے قطع نظر کرکے اس کلی مفہوم کے لئے اس کو مقرر کیا گیا ہو۔ لیکن یہ الفاظ جن افراد پر صادق آتے ہیں ان سب کا حکم شریعت میں ایک نہیں ہے۔ مثلاً انسان مرد پر بھی صادق آتا ہے اور عورت پر بھی لیکن ان دونوں کے لئے شریعت میں احکام الگ الگ ہیں اور اسی طرح بیع ایک مفہوم کلی کے لئے وضع کیا گیا اور مفہوم کلی "مبادلہ المال بالمال" ہے یہ مفہوم جن مبادلات پر صادق آتا ہے ان سب کا حکم ا ... نہیں ہے بلکہ بعض ان میں جائز ہیں، بعض ان میں ناجائز، بعض نافذ ہیں اور بعض نافذ ہیں، مثلاً خنزیر کا خمر سے تبادلہ، یہ تبادلہ ناجائز ہے، اسی طرح سونے چاندی کا ادھار تبادلہ، یہ تبادلہ بھی ناجائز ہے، اور ایسے بے شمار تبادلے کی وہ صورتیں ہیں جو جائز ہیں اور سب کو معلوم ہیں یا ... دو زندگیوں کو ایک رشتے میں جوڑ دینا اس طرح پر کہ ہر ایک کو دوسرے سے تمتع کا موقع ہو، نکاح کہلاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی مختلف الحکم افراد کو شامل ہے مثلاً فاسد نکاح، باطل نکاح موقوف نکاح، صحیح اور نافذ نکاح۔

خاص نوعی

نوع وہ کلی ہے جو ایسے کثیرین پر محمول ہوتا ہے۔ جو اغراض و مقاصد کے لحاظ سے متفق ہوتے ہیں، حقائق کے لحاظ سے نہیں۔ جیسے مرد، عورت، یہ الفاظ کلی معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں، اور جن افراد پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں ان کا شرعی حکم ایک ہو۔

خاص شخصی

وہ لفظ ہے جو ایک ایسے معین معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو جس میں شخصی انفرادیت پائی

جاتی ہو مثلاً زید، عمر، اسد وغیرہ۔

خاص عددی وہ لفظ ہے جو کسی ایک درجہ عدد کے لئے وضع کیا گیا ہو اور عدد کے اس درجے کے علاوہ کسی اور پر اس کا اطلاق نہ ہو سکے، جیسے دس، بیس، تیس وغیرہ۔

خاص کا حکم "وحکمہ ان یتناول المخصوص قطعا" خاص کا ایک حکم یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص پر قطعی طور پر شامل ہوتا ہے۔ یعنی خاص مخصوص کو جو اس کا مدلول ہے یقینی طور پر شامل ہوتا کہ غیر کا احتمال بالکل نہ ہو۔ چنانچہ جب کہا جاتا ہے "زید عالم" تو اس میں زید خاص ہے اور غیر کا کوئی احتمال نہیں رکھتا اور عالم بھی خاص ہے جو بالکل اسی طرح غیر کا احتمال نہیں رکھتا۔ غرض یہ کہ ان دونوں حکموں میں سے ہر ایک اپنے معنی مدلول کو قطعی طور پر شامل ہوتا ہے لہذا مجموعہ کلام سے زید پر عالم کا حکم لگانا قطعی ثابت ہوتا ہے۔

خاص کا دوسرا حکم یہ ہے "ولا یحتمل البیان لکونہ مبینا" وہ بذات خود واضح ہونے کی وجہ سے کسی طرح کی وضاحت کا حکم نہیں رکھتا کیونکہ وہ خود ہی واضح ہے یعنی خاص تفسیری و توضیحی بیان کا احتمال نہیں رکھتا کیونکہ وہ خود ہی واضح ہے چنانچہ خاص مجمل کا مقابل ہے کیونکہ مجمل مبہم ہونے کی وجہ سے اجمال کہنے والے کی توضیح و تفسیر کا محتاج ہے اور خاص بیان کا احتمال نہیں رکھتا پس تعدیل ارکان کو رکوع و سجود کے امر سے فرض کے طور پر ملحق کرنا جائز نہیں ہے۔ فلا یجوز الحاق التعدیل بامر الرکوع والسجود علی سبیل الفرض۔

۱۔ یہاں سے فروعی اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ احناف کے نزدیک چونکہ خاص واضح ہے اور کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے اس لئے تعدیل ارکان کو رکوع و سجود کے ساتھ ملحق کر کے فرض قرار دینا جائز نہیں، واضح رہے کہ تعدیل ارکان سے مراد رکوع و سجود میں اور رکوع کے بعد قومہ میں اور دو سجدوں کے درمیان اطمینان کرنا ہے۔ اور رکوع و سجود کے امر سے اللہ تعالیٰ کا فرمان "ارکعوا واسجدوا" ہے جو کہ فرض ہے امام شافعی کے نزدیک تعدیل ارکان فرض ہے اس سلسلے میں آپ اعرابی والی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں "خفف فی الصلوٰۃ....الخ اعرابی نے نماز میں تخفیف کی یعنی نماز کے ارکان بجالانے میں جلدی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "ارجع فصل فانک لم تصل" کہ جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی اس طرح تین مرتبہ آپؐ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں تعدیل ارکان فرض ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعرابی کو نماز لوٹانے

کا حکم نہ دیتے۔ احناف کے نزدیک چونکہ اللہ تعالیٰ کا قول "ارکعوا سجدوا" خاص ہے اور ایک معلوم معنی کے لئے ہے۔ رکوع کے معنی حالت قیام سے جھکنا اور سجود کے معنی پیشانی کو زمین پر رکھنا ہے اور جب حدیث نص مطلق کے لئے بیان نہیں ہوئی تو نسخ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ خبر واحد سے نسخ جائز نہیں ہے اس لئے ضروری ہے کہ کتاب وسنت میں سے ہر ایک کے مرتبے کا خیال رکھا جائے پس جو چیز کتاب سے ثابت ہوگی وہ واجب ہے کیونکہ سنت ظنی ہے اس لئے نماز میں تعدیل ارکان واجب ہے فرض نہیں۔

۲۔ اسی طرح خاص سے دوسرا مسئلہ وضو کے بارے میں پیدا ہوا۔ امام مالک ولاء کو فرض قرار دیتے ہیں اور ولاء کا مطلب یہ ہے کہ وضو کرنے والا وضو میں اپنے اعضاء کو مسلسل اور پیہم اس طرح دھوئے کہ پہلا عضو خشک نہ ہونے پائے وہ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اصحاب ظواہر کے نزدیک وضو کرتے وقت بسم اللہ کہنا فرض ہے اور وہ اس میں قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "لا وضوء لمن لم یسم" کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ وضو میں ترتیب کا لحاظ رکھنا اور نیت کرنا فرض ہے اور دلیل کے طور پر آپ مندرجہ احادیث پیش کرتے ہیں

۱۔ لا یقبل اللہ صلوٰۃ امرء حتی یضع المطہور فی مواضعہ فیغسل وجہہ ثم یدیہ

۲۔ انما الاعمال بالنیات۔

پہلی حدیث میں لفظ ثم ہے جو کہ ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسری حدیث میں لفظ اعمال ہے۔ اور وضو بھی ایک عمل ہے۔ اعمال کی صحت نیت پر موقوف ہے اس لئے اس عمل (وضو) کو سرانجام دیتے وقت بھی نیت ضروری ہے۔

احناف کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے وضو میں غسل اور مسح عضو کا حکم دیا ہے غسل کا مطلب پانی بہانا اور مسح کا مطلب تر ہاتھ پہنچانا ہے اور یہ دونوں خاص لفظ ہیں: جو معلوم معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں قول باری تعالیٰ ہے:

یا ایھا الذین امنوا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین۔

جس چیز کا ثبوت سنت سے ہو مناسب ہے کہ وہ واجب ہو جیسے نماز میں لیکن وضو میں بالاتفاق

واجب نہیں ہے کیونکہ واجب فرض کے درجے میں ہے اور جو چیز واجب ہوتی ہے وہ عبادات مقصودہ کے برابر ہوتی ہے اس لئے وضو کی شرائط واجب نہیں سنت ہیں۔ یہاں واجب اور سنت میں فرق ہے۔

۳۔ خاص سے تیسرا مسئلہ پیدا ہوا جو کہ طواف میں طہارت کی شکل ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

ولیطوفوا بالبیت العتیق

امام شافعی فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کا طواف طہارت کے بغیر جائز نہیں اور دلیل کے طور پر آپ دو حدیثیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ **الطواف بالبیت صلوۃ**۔

۲۔ **الا لا یطوفن بالبیت محدث ولا عریان**۔

مندرجہ حدیثوں میں طواف کے لئے طہارت کو ضروری قرار دیا گیا لیکن احناف کے نزدیک چونکہ طواف ایک خاص لفظ ہے جس کے معنی معلوم ہیں یعنی بیت اللہ کے ارد گرد چکر لگانا، لہذا اس میں طہارت کی شرط لگانا خاص کے لئے بیان نہ ہوگا۔ کیونکہ خاص بذات خود واضح ہے بلکہ یہ شرط لگانا نسخ ہوگا لیکن خبر واحد سے نسخ جائز نہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ طہارت کی شرط واجب ہوگی۔

۴۔ خاص کے مذکورہ حکم سے چوتھا مسئلہ پیدا ہوا جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے متعلق ہے۔

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء

قروء لغت کے لحاظ سے طہر اور حیض دونوں کے معنی میں مشترک ہے۔ امام شافعی نے قروء سے معنی اطہار لئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **فطلقوھن لعدتھن** اس میں لعدتھن کی لام وقت کے لئے ہے چنانچہ آیت کے معنی ہوں گے۔ **فطلقوھن لوقت عدتھن** اور وقت سے مراد طہر ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ طلاق طہر ہی میں مشروع ہے اور امام اعظم نے اللہ تعالیٰ کے قول ثلثۃ کی وجہ سے قروء سے حیض مراد لیا کیونکہ لفظ ثلاثۃ خاص ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی کا احتمال نہیں ہے۔

اس حکم میں اگرچہ لفظ قروء (مفرد قرء) کا اطلاق حیض پر بھی ہو سکتا ہے اور طہر پر بھی مگر لفظ ثلاثۃ خاص ہے اور معنی معلوم کے لئے ہے۔ اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ تین کی جگہ ساڑھے تین، یا اڑھائی مراد نہیں لئے جا سکتے۔ لہذا اس لفظ کی شرعی حیثیت تب ہی برقرار رہ سکتی ہے جب قروء سے مراد حیض

لیا جائے جیسا کہ احناف کے نزدیک ہے۔ اور اگر اس سے طہر مراد لیا جائے جیسا کہ امام شافعی کے نزدیک ہے تو لفظ ثلاثہ پر پورا عمل نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ امام شافعی اس طہر کو بھی عدت میں شمار کرتے ہیں جس میں عورت کو طلاق ہوئی تو اس طرح تین طہر کا پورا ہونا ناممکن ہے قرء تین سے کم ہوں گے یا زیادہ۔

۵۔ چونکہ خاص بیّن ہوتا ہے اور اس کا مدلول قطعی واجب الاتباع ہوتا ہے اس لئے اپنی عورت سے خلع کر لینے کے بعد بھی اس کو طلاق دینا صحیح ہے لیکن شوافع فرماتے ہیں کہ خلع کے بعد پھر طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ خلع کے معنی طلاق کے نہیں ہیں بلکہ فسخ نکاح ہیں اس لئے خلع کے بعد نکاح ہی باقی نہیں رہتا جو طلاق کو قبول کر سکتا ہو احناف کی طرف سے یہ جواب [illegible] باری تعالیٰ نے طلاق کے ذکر میں اولاً فرمایا ہے الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان یعنی طلاق رجعی دو ہی ہیں تیسری طلاق کے بعد پھر رجعت بغیر حلالہ ممکن نہیں ہے جیسا کہ عرب ایام جاہلیت میں بیویوں کو طلاق برابر دیتے رہتے تھے اور پھر رجعت بھی کرتے رہتے تھے جس کی کوئی حد نہ تھی اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ طلاق شرعی یہ ہے کہ ایک ایک کر کے طلاق دی جائے۔ یک مرتبہ دو طلاقیں نہ دی جائیں۔ اب ان دونوں طلاقوں کے بعد اگر شوہر بیوی کو پھر رکھنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ حسن معاشرت سے رکھے اور اگر چھوڑنا چاہتا ہے تو پھر بھی لازم ہے کہ شرافت کے ساتھ اسے چھوڑ دے اس آیت کے بعد پھر باری تعالیٰ نے خلع اور اس کا حکم بیان فرمایا فان خفتم ان لا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ یعنی اے حکام وقت اگر تمہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور ان کے رہن سہن میں شریفانہ برتاؤ قائم نہ رہ سکے گا تو اس وقت اگر زوجہ زوج کے حق کو کچھ فدیہ دے کر زوج سے چھڑا لے اور زوج بھی اس کو قبول کرے اور اس کو طلاق دیدے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت خلع کرا سکتی ہے جس میں دو کام ہوں گے ایک فدیہ کا دینا، تو یہ زوجہ کا کام ہے اور دوسرا اس کو قبول کر کے علٰحدہ کرنا تو یہ زوج کا کام ہے کیونکہ طلاق تو فی الواقع مرد ہی کا کام ہے اس میں عورت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اگر زوج کی یہ علیحدگی طلاق نہ ہوتی بلکہ فسخ ہوتا جس کے معنی رفع حکم سابق کے ہیں تو اس میں زوجین کی ضرورت ہوگی فقط زوج سے فسخ نہ ہوگا لہٰذا یہ طلاق ہوئی، جیسا کہ احناف فرماتے ہیں اس کے بعد باری تعالیٰ نے فرمایا فان طلقہا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ یعنی اگر وہ شوہر اپنی بیوی کو اس کے بعد پھر تیسری مرتبہ

بھی طلاق دیدے تو وہ عورت اب بغیر حلالہ شرعیہ حلال نہ ہوگی - اس آیت کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس کا آیت مذکورہ بالا الطلاق مرتان سے تعلق ہے لہذا فان طلقہا والی طلاق تیسری طلاق ہوگی - اور بیچ میں خلع کا ذکر بطور جملہ معترضہ کے ہے کیونکہ خلع تو فسخ کو کہتے ہیں اس کے بعد طلاق تو ممکن ہی نہیں ہے لیکن احناف کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "فا" موجود ہے جو خاص ہے اس کا ذکر خلع کے بعد ہے لہذا خاص پر عمل کرتے ہوئے یہ ثابت ہوا کہ خلع کے بعد بھی طلاق جائز ہو اور خلع بھی طلاق ہو - فسخ نہ ہو کیونکہ فسخ کے بعد طلاق ممکن نہیں ہوتی -

اس سر پر سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ طلاقیں کل چار ہوسکتی ہیں حالانکہ تین پر اجماع ہے اس طرح سے کہ دو تو الطلاق مرتان میں اور ایک طلاق خلع میں اور ایک چوتھی طلاق فان طلقہا میں - لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس آیت میں خلع کا ذکر کوئی مستقل نہیں ہے بلکہ یہ خلع فی الحقیقت ماقبل کی دونوں طلاقوں کے ضمن میں مذکور ہے کیونکہ اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں طلاقیں اگر رجعیہ ہوں تو اس وقت شریفانہ طریقہ سے رکھنا ہوگا یا شرافت کے ساتھ چھوڑنا ہوگا اور اگر وہ دونوں طلاقیں خلع کے ضمن میں ہوں تو وہ بائنہ ہو جائیں گی (بغیر نکاح ثانی حلال نہ ہوگی) اور اگر اس کے بعد بھی اس نے طلاق دیدی تو وہ مغلظہ ہوگی (بغیر حلالہ کے حلال نہ ہوگی) اس بیان سے لوگوں کے اعتراضات جو احناف پر اس موقع پر وارد ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے۔

۶- مفوضہ اگر تفعیل سے اسم فاعل بکسر الواؤ ہو تو وہ عورت مراد ہوگی جس نے اپنے آپ کو بلا شرط مہر کسی کے نکاح میں دے دیا - یہ نکاح امام شافعی کے ہاں جائز نہ ہوگا - احناف اسے جائز قرار دیتے ہیں اس جگہ اس مسئلے سے بحث نہیں ہے اور اگر بفتح الواؤ اسم مفعول ہو تو وہ عورت مراد ہوگی جس کو اس کے ولی نے کسی کے نکاح میں دے دیا، مہر کے تذکرے کے بغیر یا اس شرط کے ساتھ کہ مہر واجب نہ ہوگا - امام شافعی فرماتے ہیں کہ زوجین میں سے اگر کوئی ایک قبل وطی مر جائے تو مہر لازم نہ ہوگا - ہاں اگر وطی بھی پائی جائے تب مہر واجب ہوگا - احناف کے ہاں اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ چونکہ خاص بیان کا احتمال نہیں رکھتا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے اس لئے اس مسئلے میں وطی کی شرط کے بغیر نفس عقد سے ہی مہر واجب ہوگا لیکن اس کی ادائیگی بوقت وطی یا بعد الموت واجب ہوگی چونکہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے واحل لکم ما وراء ذٰلکم ان تبتغوا باموالکم یعنی محرمات کے علاوہ تم جس کو پسند کرو

مال دے کر وہ تمہارے لئے حلال ہوگی ۔ اس میں ان تبتغوا ماوراء کم سے بدل ہے یا مفعول لہ ہے ۔ اس وقت لام پوشیدہ ہے اصل عبارت یہ تھی احل لکم ماوراء المحرمات لان تبتغوا با موالکم اس وقت با موالکم کا حرف "با" خاص ہے جو معنی معلوم یعنی الصاق (ملانے) کے لئے موضوع ہے یا یہ کہ ان تبتغوا میں ابتغاء (خواہش) لفظ خاص ہے جو معنی معلوم یعنی طلب کے لئے موضوع ہے ۔ بہر صورت یہ واجب ہوگا یعنی خواہش انتفاع مہر کے ساتھ ہو ورنہ نہیں اور یہ مہر لفظاً مذکور بھی ہو اگر بالفرض وہ مہر لفظاً مذکور نہ ہو تو کم از کم ذمہ میں ہی ہو جائے گا البتہ یہ شرط ضرور ہوگی کہ وہ خواہش زوجہ بطریق صحیح ہو اسی لئے اگر نکاح فاسد کے ذریعے ہو تو اس وقت بالاجماع بعد وطی مہر واجب ہوگا قبل وطی ممکن نہیں ۔ اسی طرح اگر وہ ابتغاء بطریق نکاح نہ ہو بلکہ بطریق اجرت یا بطریق متعہ یا بطریق زنا ہو تو نہ یہ افعال خود صحیح ہوں گے اور نہ ہی مال واجب ہوگا ۔

۷ ۔ چونکہ خاص واجب العمل ہے اور محتمل بیان نہیں ہوتا اسی قاعدہ کی وجہ سے مقدار مہر باری تعالیٰ کی طرف سے مقدر رہنا ہوگا اس کی مقدار بندوں کے اختیار پر نہیں چھوڑی گئی ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام شافعی کا زمان ہے کہ مہر کی مقدار کی تعیین بندوں کی اور اس کے اختیار پر نہیں چھوڑی گئی اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام شافعی کا فرمان ہے کہ مہر کی مقدار کی تعیین بندوں کی رائے اور ان کے اختیار پر چھوڑ دی گئی ، لہذا ہر وہ چیز جو کسی شے کے ثمن میں ادا کی جاسکتی ہو وہ مہر بھی ہو سکتی ہے لیکن احناف کے ہاں تعداد کی انتہا اگرچہ باری تعالیٰ نے مقرر نہیں کی ہے اس لئے جہاں تک بھی مہر کی تعداد بڑھائی جا سکے درست ہوگا لیکن کم از کم مہر کتنا ہونا چاہیئے تو کتاب وسنت نے اسے مقرر فرما دیا ہے لہذا اس سے بھی کم مہر کا ہونا درست نہ ہوگا اور وہ مقدار دس درہموں کی ہے ۔ قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم یہی آیت شریفہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق ازواج (مہر) کیا ہے اور ہم نے اسے کیا مقرر کیا ہے ، اسے ہم بخوبی جانتے ہیں ۔ اس آیت میں مقدار مہر کی کم از کم مقدار کی فرضیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لفظ فرض ، فرضنا میں خاص ہے ۔ معنی معلوم یعنی تقدیر وتعیین کے لئے موضوع ہے ۔ اسی طرح ناضمیر متکلم بھی خاص ہے لہذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ مہر کی مقدار اللہ تعالیٰ کے علم میں مقرر اور مقدر ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمادی ۔

یعنی مہر نکاح دس درہموں سے کم ہو ہی نہیں سکتا اور چونکہ یہ مقام بضع ایک مستقل عضو ہے جس کی قیمت یا عوض دس دراہم ٹھہری تو احناف نے اسی سے قیاس کر لیا کہ اعضاء بدن کا کوئی

عضو دس دراہم سے کم نہ ہو، معاوضے کے لحاظ سے پس سرقہ کی قطع ید کے لئے اتنے مال کا سرقہ ہونا ضروری ہے جو دس دراہم سے کم نہ ہو۔

شرعی حکم کتاب اللہ کے خاص کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب ہوگا اور اگر اس کے مقابلے میں خبر واحد یا قیاس آجائے تو حتی الوسع دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی بشرطیکہ خاص سے معنی میں تغیر واقع نہ ہو اور اگر ان کا جمع کرنا ناممکن ہو تو کتاب اللہ پر عمل کیا جائے گا۔ خبر واحد یا قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

علمائے اصول یہ کہتے ہیں کہ خاص چونکہ دلالت میں قطعی ہوتا ہے اس لئے تاویل کا احتمال نہیں ہوتا اور چونکہ اس کی دلالت واضح ہوتی ہے اس لئے اس کو مزید واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خاص کی مثال یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کنّ نساء فوق الاثنتین فلھن ثلثا ما ترک وان کانت واحدۃ فلھا النصف اس آیت میں ثلثا، نصف، واحدہ، یہ تمام کلمے خاص ہیں۔ ان کے معنی معین اور معلوم ہیں ان الفاظ کی دلالت معانی پر یقینی اور واضح ہے لہذا اس میں کوئی تاویل کی گنجائش نہیں اور کسی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں۔ ان الفاظ کے جو تقاضے ہیں وہ بلا کم وکاست پورے کئے جائیں گے